کتاب سے پہلے

ہماری تاریخ کے روشن صفحات سے متعلق مطالعات و واقعات سے اسلامی و تاریخی لائبریری پُر ہے۔ اسلامی تہذیب سازوں پر مصنفین نے بہت کچھ لکھا ہے، نامور اسلاف کی سیرت اور یورپ وغیرہ ممالک پر اسلام کے احسانات کو بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

اسلامی تاریخ کے اس پہلو کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ کوئی افسانوی تاریخ ہے اور اس تاریخ کے افراد انسان نہیں فرشتے ہیں۔

تاریخ کے اس موضوع پر اظہار خیال مختلف وجوہ سے اہم اور نازک ہے۔

اول یہ کہ ہماری تاریخ کے تجزیہ کا کام اب تک اس تاریخ کے دشمنوں نے انجام دیا ہے، اور اسی لئے اس کے صرف منفی پہلوؤں پر توجہ دی ہے، کچھ عقل پرستوں کو ماضی کا یہ غیر معروضی تذکرہ پسند نہیں آیا تو وہ ان مستشرقین کے پیچھے ہو گئے جو صرف اس لئے ہماری تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں کہ اسے اور اس کے افراد کو دنیا کے سامنے مسخ کر کے پیش کریں۔

دوم یہ کہ مستشرقین کے انداز بحث و تحقیق سے دھوکہ کے نتیجہ میں ردعمل کے طور پر اس تاریخ سے متعلق بہت سے حقائق ضائع اور مسخ ہو گئے، اور اس تاریخ کے بارے میں لوگ دو حصوں میں بٹ گئے ہیں، ایک گروہ تو اسے کلی طور پر رد کرتے ہوئے یہ سمجھتا ہے کہ اس سے ترقی اور

مستقبل کی تعمیر میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا گروہ یہ سمجھتا ہے کہ یہی تاریخ سب کچھ ہے، اور اس کا مثبت حصہ اس بات کا مستحق ہے کہ ہم اسے بعینہٖ اپنے لئے نمونہ قرار دیں اور پھر اسی کو دہرائیں۔

ایسی صورت میں حقیقت کا سراغ بھی ملتا ہے اور حقیقت ضائع بھی ہو جاتی ہے۔

سوم یہ کہ صرف مدح و تعریف پر توجہ کے اسلوب کو چھوڑ کر ہم نے تاریخ سے استفادہ کے پہلو پر زور دیا ہے۔ تاریخ میں صرف مدح و تعریف پر اکتفاء سے بعض لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اس دور میں ہمیں جن مشکلات اور چیلنجوں کا سامنا ہے ان کی مثال ہماری تاریخ میں نہیں ہے، اس وجہ سے انھیں بڑی مایوسی کا سامنا ہوتا ہے اور وہ شاید یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم مسلمان پھر دوبارہ اپنی کوششوں کا سلسلہ شروع نہیں کر سکتے، ایٹمی قوت اور فضائی راکٹوں کے اس دور میں جب کہ ہم گھڑیاں، کار اور دوسرے چھوٹے چھوٹے آلات برآمد کرتے ہیں اپنی طرف سے ہم زندگی کو کیا دے سکتے ہیں؟

اس کتاب میں ہماری تہذیب کے ان پتوں کا ذکر ہے جو مرجھا چکے ہیں، اور ان مسلم حکومتوں کے زوال کی داستان ہے جو بھیانک امراض میں مبتلا ہو کر فنا ہوئیں، ان کی تاریخ ہمارے لئے دائمی طور پر عبرت و نصیحت ہے، مشکل اوقات میں ان اسلاف نے دشمنوں سے مداوا چاہا، انھیں زہر کی گولیاں دینے کا موقع ملا، یہ سبق ہمیں اندلس اور بحیرۂ روم کے جزیرۂ سسلی وغیرہ کی حکومتوں میں زیادہ واضح آتا ہے۔

تاریخی طور پر یہ بھی ذہن میں رکھنے کی بات ہے کہ اندلس کا آخری شہر غرناطہ جس صدی (۱۴۹۲ء) میں مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا اسی صدی (۱۴۵۳ء) میں مسلمانوں نے قسطنطنیہ فتح کیا، اور اس فتح کے نتیجہ میں مسلمانوں کو مزید پانچ صدیوں کے لئے تقویت حاصل ہو گئی۔

اندلس اپنے سقوط کے وقت اس عضو کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جسے ختم ہونا ضروری تھا، اس لئے قضاء الٰہی صادق ہوئی۔

اسلام کی نئی تاریخ تعمیر کرنے کے لئے وسط ایشیا سے ایک دوسری مضبوط طاقت ابھری جس نے تقریباً تین صدی تک یورپ کے صلیبی کینہ پروروں کو خوف و ہراس میں مبتلا رکھا۔

اندلس سے جو سبق ملا اسے ہمیں فراموش نہ کرنا چاہیئے، وہاں پر سقوط کے درج ذیل عناصر تھے:

اول یہ کہ جنس و نسل کی کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔

دوم یہ کہ اسلام کے ایک جھنڈے کے علاوہ جسے لوگوں کے قلب و ذہن سے تعلق تھا، دوسرے بہت سے جھنڈے سامنے آ گئے تھے۔

سوم یہ کہ اندلس کے مسلمانوں نے آپس میں ایک دوسرے کے خلاف دشمن عناصر سے تعاون حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔

سقوط کے دیگر اسباب کا تعلق بھی انھیں مذکورہ اسباب سے تھا۔

اندلس کے تمام مسلمانوں کو اپنی غلطیوں کی قیمت ادا کرنی پڑی، اس سلسلہ میں حکام کو اللہ تعالیٰ نے ذلیل کیا اور حکومت ان کے ہاتھوں سے جاتی رہی، مراکش بعید کے شہر اغمات میں مرابطین کے ہاتھوں ابن عباد کی رسوائی اور اس کے دردناک اشعار کون بھول سکتا ہے؟ مریہ کے حاکم ابن صمادح

کا یہ قول کون بھول سکتا ہے ؟ کہ : ہمارے حق میں موت بھی کرکری بنا دی گئی‘‘
غرناطہ کے آخری بادشاہ ابو عبد اللہ نے جسے یورپ میں اسلامی وجود کی آخری کڑی کہہ سکتے ہیں، اندلس سے روانہ ہوتے ہوئے اپنی ماں کے اس جملہ کو بار بار یاد کیا کہ : جس ملک کا تحفظ تم مردوں کی طرح نہ کرسکو اس پر تمھیں عورتوں کی طرح آنسو بہانا چاہیئے ۔

مسلم عوام کو اپنی غفلت اور حکام کو تنبیہ نہ کرنے کی اس طرح قیمت ادا کرنی پڑی کہ ان کے گھر جلادیئے گئے، مال و دولت کو لوٹ لیا گیا، دین اور نام سب کچھ بدلنے پر مجبور کیا گیا اور صلیبیت نے معمولی انسانی حقوق سے بھی انھیں محروم کر دیا ۔

تہذیب کے مرجھائے ہوئے پتوں میں سے اکثر یوں تھے کہ بلندی حوصلہ، نسلی دعوت، مذہبی نعرہ کی مدافعت یا صورتِ حال پر قابو کے سلسلہ میں بنو امیہ اور بنو عباسیہ جیسی بڑی حکومت کی ناکامی سے محض حکومت کی شکل میں تبدیلی آجاتی تھی، جس کی وجہ سے حرص و ہوا اور مختلف نعروں کو ابھرنے کا زیادہ موقع ملا ۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تمام پتے خراب یا اچھے تھے، ممکن ہے ان میں سے بعض ایسے رہے ہوں جو اسلام کی صحیح راہ پر چلنے کے لئے بڑی حکومتوں کو متوجہ کرنا چاہتے ہوں، ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ حکومتوں کو بدلنے کا انجام ہمیشہ برا ہی رہا، بعض بھلائیاں بھی ہوئیں لیکن ممکن ہے ہم ان کو جان نہ سکے ہوں ۔

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تاریخ ہمیشہ عمودی شکل میں اپنا راستہ طے کرتی ہے خواہ اوپر یا نیچے، مجھے اس سے اتفاق نہیں، اسلامی تاریخ کا تجربہ

ہمیں بتاتا ہے کہ اسلام جیسی عظیم تہذیبوں کے دائرہ میں تاریخ کی حرکت لولبی SCRFW-SHAPED ہوتی ہے، کبھی نیچے کو جھکاؤ ہوتا ہے اور کبھی اوپر کو، یہ ایک دائری حرکت ہوتی ہے جس میں منظم طور پر ھبوط و صعود کے مرحلے آتے ہیں، ھبوط اس وقت ہوتا ہے جب اندرونی طور پر اختلاف و فساد پیدا ہو جائے، اور صعود اس وقت ہوتا ہے جب خارجی چیلنجوں کو قبول کرلیا جائے ۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس امت کے تاریخی تجربہ میں ھبوط کے مرحلے اندرونی حالات سے مربوط رہے، اس امت پر باہر سے جتنی زد نہیں پڑی اس سے زیادہ اندر سے پڑی، بلکہ خارجی دشمنوں کو نقصان پہونچانے کا موقع ہی اس وقت ملا جب اندر لگے ہوئے گھن کے ذریعہ ان کو راہ ملی ۔ پھر دشمنوں کی مداخلت سے ہمیں فوائد بھی حاصل ہوئے، اس طرح اسلامی ضمیر بیدار ہوا، جہاد عام کا اعلان ہوا، صلاح الدین اور سیف الدین جیسی شخصیتیں ابھریں اور مسلمانوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا ۔

امتِ مسلمہ اپنی پنہاں قوتوں کے باعث ہر طرح کے خارجی چیلنج کا جواب دینے کی اہل رہی ہے، تاریخ کے اکثر مرحلوں میں اگر حکام اس کی حرکت کو شل نہ کرتے، دشمنوں کے سامنے نہ جھکتے اور اپنے تحفظ کی غرض سے اس کی طاقت کو منتشر نہ کرتے، بلکہ امت کو اس کی فطرت، اس کی میراث اور اقدار و تہذیب کے حوالہ کر دیا جاتا تو یقیناً اس کی تاریخ میں بہت سے ایسے موڑ آتے جن سے امت کو مزید عروج و ترقی حاصل ہوتی ۔

o o o

ان مرجھائے ہوئے پتوں کا ذکر کرکے میں اسلامی تاریخ کے تین گوشوں

پر نگاہ ڈالنا چاہتا ہوں : اندلس (یورپ) ، مشرق عربی جس میں دو عظیم سلطنتیں قائم ہوئیں (عباسی و فاطمی) ، اور مغرب عربی ۔ انھیں تینوں بازوؤں نے عالم اسلام کی قیادت کی اور دنیا کے مسلمانوں کی فکری و سیاسی نمائندگی کا فرض انجام دیا ۔

میں نے جن پہلوؤں کو اختیار کیا ہے وہ بطور نمونہ ہیں ، چنانچہ ایسی دوسری حکومتیں بھی ہیں جن میں زوال کی مذکورہ علامتیں موجود ہیں ، لیکن اس کتاب میں استقصاء مقصود نہیں ۔

○ ○ ○

یہ کتاب ہماری تاریخ کی ایک خاص طرح کی خوراک ہے ، جس میں بہت زیادہ چکنائی اور اشتہا انگیز چیزوں کی آمیزش نہیں ، کیونکہ انسانی جسم کی طرح تہذیب کے جسم کو بھی زیادہ چکنائی راس نہیں آتی ۔

ان سطور میں یہ دعوت ہے کہ ہماری تاریخ کی از سر نو غیر معمولی جرأت سے تشریح کی جائے ، ہم اگر اس فرض کو انجام دیں تو یقیناً ان لوگوں کے مقابلہ میں بہتر ہوگا جو علمی انداز بحث کے مدعی بن کر فساد و حسد اور ظلم و زیادتی کے ساتھ اس کی تشریح کرتے ہیں ۔

اس کتاب میں ان لوگوں کے لئے بھی مواد موجود ہے جو معلومات ، بحث و تمحیص یا مستقبل کے خد و خال کی معرفت کے لئے تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں ۔

اخیر میں یہ بھی کہنا ہے کہ : یہ امت ضرور باقی رہے گی ، اور ضرور اپنا کردار ادا کرے گی ، اور ضرور اپنی غفلت دور کرے گی ، تاریخ کے چودہ سو سالہ مزاج سے ہمیں اسی کا یقین ہوتا ہے ۔

ہم اکثر لغزشوں کے بعد اٹھے ہیں ، ہم نے پوری دنیا سے جنگ کی ہے اور غالب و فتحمند ہوئے ہیں ، صرف شرط یہ ہے کہ :
ہم یہ جان لیں کہ کہاں سے ابتدا کرنی ہے اور ہماری منزل کونسی ہے ؟ تاریخ نے ہمیں ہمیشہ یہ تعلیم دی ہے کہ اس امت کی آخری نسلوں کا سدھار انہیں چیزوں سے ہوگا جن سے ابتدائی نسلوں کا سدھار ہوا ہے ۔

د ر عبدالحلیم عویس

فصل اوّل

یورپ میں ہمارے زوال کی داستان

- یورپ میں ہمارا آخری قدم
- "شاہینِ قریش" کی اولاد کا زوال
- طوائف الملوک کا زوال
- فردوسِ گم شدہ کی داستان
- اندلس کی ایک دوسری داستان
- فردوس کے ایک اور حصہ کا زوال
- اندلس میں ہماری آخری "شکست گاہ"
- غرناطہ کا زوال۔

یورپ میں ہمارا آخری قدم

ہماری تاریخ میں غنیمت کی داستان عجیب ہے، اس سے ہمیں جو سبق ملتا ہے وہ اور زیادہ عجیب ہے۔

ہماری اولین شکست کا سبب یہی غنیمت ہے، اور اسی کے باعث اپنی فتوحات کے آخری سلسلہ کے پاس ہمیں رکنا پڑا۔ غنیمت کی داستان دراصل ہماری تاریخ میں شکست کی داستان ہے۔

پہلے معرکہ میں ہمارے قائد خود رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم تھے۔ تیر اندازوں نے آپؐ کے حکم کی خلاف ورزی کی اور اندیشہ کیا کہ غنیمت کا موقع ہاتھ سے نکل جائے گا، جس کے نتیجہ میں احد کا واقعہ پیش آیا، اور اسی غنیمت کے باعث ستر بہترین مسلمان شہید ہوئے۔

اور آخری معرکہ کا قائد عبدالرحمٰن غافقی تھا، یہ وہ آخری مسلمان تھا جس نے کوہِ "البرانس" عبور کر کے فرانس فتح کرنے اور پھر قلب یورپ میں داخل ہونے کے لئے منظم اسلامی فوج کی قیادت کی تھی۔

اسلامی تاریخ کے فیصلہ کن اور زندۂ جاوید معرکہ "بلاط الشہداء"[1] میں غافقی کو شکست ہوئی، یورپ کی فتح سے متعلق مسلمانوں کا خواب

---

[1] فرانس کے شہر پواتیر POITIERS میں اکتوبر ۷۳۲ء میں جو معرکہ اسلامی اور فرانسیسی فوجوں کے مابین پیش آیا اسے عرب مؤرخ بلاط الشہداء کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس معرکہ میں فرنج سپہ سالار چارلس مارٹل اسلامی فوجوں کی پیش قدمی کو روکنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا، اور اس سلسلہ کا یہ صفحہ لپیٹ دیا گیا، اس شکست کا سبب بھی وہی تھا جس کی طرف ابتدائی سطروں میں اشارہ کیا گیا یعنی غنیمت۔

مغرب عربی اور مسلم اسپین میں جب سے مسلمانوں کو استقرار نصیب ہوا وہ البرانس کو عبور کرکے آگے کے حصہ کو فتح کرنے کی ہمت اور حوصلہ رکھتے تھے، موسیٰ بن نصیر نے اس ارادہ کا اظہار کیا لیکن خلیفہ ولید بن عبد الملک نے مسلمانوں کے نامعلوم راستوں میں ڈالنے کا خطرہ مول نہ لینے دیا۔ پھر اندلس کے حاکم (۱۰۰-۱۰۲ھ) سمح بن مالک خولانی نے سنجیدہ طور پر عزم کیا اور آگے بڑھ کر فرانس کے جنوب میں بحیرۂ روم کے ساحل سے متصل ایک علاقہ (سبتمانیہ) پر قبضہ کرلیا۔ البرانس کی چوٹیوں کو عبور کر کے سمح آگے بڑھا اور فرانس کی سرزمین پر قدم رکھ دیا، دریائے (گارون) GARONNE کے رخ پر مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے راستہ کے متعدد شہروں پر قبضہ کرلیا اور فرانس کے جنوب میں (تولوز) TOULOUSE تک جا پہنچا، لیکن وہاں اس کے قدم نہ جم سکے اور مارا گیا، اس کی باقی ماندہ فوج اس کے ایک قائد عبد الرحمٰن غافقی کی قیادت میں واپس لوٹ آئی، اس مہم میں سمح کو صرف (سبتمانیہ) پر تسلط حاصل ہوسکا۔

سمح کے بعد نئے حاکم عنبسہ بن سحیم کلبی نے یورپ کی جانب پیش قدمی کی، اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور دریائے (رون) RHONE کے بالائی حصہ میں (آتون، AUTUN) تک پہونچنے میں کامیاب ہوگیا، یہ شخص محتاط نہ تھا، واپسی کی راہ کا بندوبست نہ کیا اور مارا گیا، اس کی فوج سبتمانیہ کے شہر اربونہ واپس آگئی۔

لیکن یورپ کی جانب پیش قدمی کرنے والوں میں عبد الرحمٰن غافقی کی شخصیت زیادہ فیصلہ کن تھی، اس کے دل میں ایمان کی قوی روح اور سمح کی ناکامی کا انتقام لینے کا جذبہ موجود تھا، فوج کے ساتھ سبتمانیہ پہونچ کر غافقی نے اندلس اور افریقہ میں جہاد کی دعوت کا اعلان کردیا، رضاکاروں کے وفود ہر طرف سے آنے لگے اور چڑھائی کے لئے عظیم تیاری شروع ہوگئی۔

پیرس سے قریب "تورو" اور "پواتیر" کے شہروں میں عرب اور بربر مسلمانوں کی نصرانیوں سے مڈبھیڑ ہوئی، حکومت فرنگ کا وزیر اور محل کا سکریٹری (چارلس مارٹل) نصرانیوں کا قائد تھا، اور عبد الرحمٰن غافقی مسلم فوج کی قیادت کررہا تھا۔

تقریباً سات دن تک سخت جنگ ہوتی رہی، افرنگی فوج اور اس کے حلیفوں کی تعداد عرب فوج سے زیادہ تھی، لیکن مسلمانوں نے لڑائی میں کھل کر داد شجاعت دی، مگر پھر بھی انھیں فتح نہیں حاصل ہوئی، اس کا سبب بھی وہی غنیمت تھی۔

نصرانیوں کو یہ معلوم تھا کہ اسلامی فوج کے پاس پچھلی فتوحات کا بہت سا مال غنیمت ہے جو قرطبہ سے پواتیر تک کی لڑائیوں سے حاصل ہوا ہے، مسلمانوں کی پشت ان غنیمتوں سے بوجھل ہے، اور عربوں کی یہ عادت ہے کہ وہ غنیمت کا مال ساتھ لے کر چلتے ہیں، فوج کے پیچھے ایک ٹولی اس کا تحفظ کرتی ہے۔

نصاریٰ نے یہ بات معلوم کرنے کے بعد مخصوص طور پر اسی حصہ پر حملہ کیا، مسلمان اس چال کو سمجھ نہ سکے، نصرانی حملہ کے بعد بعض ٹولیاں مال غنیمت کے تحفظ کے لئے عقبی حصہ کی طرف پلٹ کر لڑنے لگیں، اس سے

فوج کے نظام میں ابتری پیدا ہو گئی، ایک ٹولی غنیمت کے تحفظ کے لئے پیچھے گھوم کر لڑ رہی تھی اور دوسری دشمنوں کے مقابلے میں آگے لڑ رہی تھی۔

عبدالرحمٰن غافقی نے نظام کو سنبھالنے کی بے حد کوشش کی لیکن ابھی کوئی نتیجہ سامنے نہیں آسکا تھا کہ اچانک ایک تیر آکر اس کو لگا اور وہ جاں بحق ہو گیا، اب اسلامی فوج بغیر قائد ہو گئی، نصرانیوں نے ہر طرف سے گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا اور بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔

بلاط الشہداء کا یہ واقعہ سنہ ۱۱۴ھ میں پیش آیا، یورپ کی سمت میں یہ آخری پیش قدمی تھی، پھر یہ سلسلہ ختم ہو گیا کیونکہ مادہ کی چمک دمک ایمان کی شعاعوں پر غالب آچکی تھی۔

جو لوگ تلاش غنائم کے گڈھے میں گرتے ہیں ممکن نہیں کہ وہ کسی عقیدہ یا تہذیب کا علم بلند کر سکیں۔

"شاہین قریش" کی اولاد کا زوال

ایک خلافت سے دوسری خلافت پیدا ہوئی، ابو مسلم خراسانی اور ابو عبیداللہ سفاح نے دمشق کی اموی خلافت کو سنہ ۱۳۲ھ میں ختم کر دیا تھا، آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد مصر کے شہر حلوان میں مارا گیا، لیکن اس زائل شدہ خلافت کا ایک عجیب و غریب بیج اس سرزمین پر برگ آور ہوا جو اموی دارالخلافہ سے ہزاروں میل دور سمندر پار واقع تھی۔

اندلس میں اس خلافت کا بانی و ہیرو عبدالرحمٰن بن معاویہ بن ہشام بن عبدالملک بن مروان تھا، اس کے اندلس پہونچنے کی داستان کسی ناول کے عظیم کردار سے کم نہیں۔

قریش کا یہ شاہین عباسی فوجیوں کے ڈر سے بھاگتا ہوا فلسطین پہونچا، پھر مصر آیا، پھر بچتے بچاتے پانچ سال بعد مغرب پہونچا۔

اندلس میں اس وقت عباسیوں کی جانب سے یوسف بن عبدالرحمٰن فہری گورنر تھا، فہری نے عبدالرحمٰن داخل کی جمعیت کو ختم کرنے کی کوشش کی، سنہ ۱۳۹ھ میں دونوں کی مدبھیڑ ہوئی، اس لڑائی میں فہری شکست کھا گیا اور عبدالرحمٰن قرطبہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا اور اس طرح امویوں نے اندلس میں ایک نئی حکومت کی داغ بیل ڈال دی۔ ابو جعفر منصور کے دور میں عباسیوں نے اندلس کو واپس لینے کی پوری کوشش کی، لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی۔

صلیبی بادشاہ (شارلیمین) نے بھی عبدالرحمٰن کے خلاف حالات سے فائدہ اٹھانا چاہا لیکن اسے بھی ناکامی ہوئی، اور نتیجہ کے طور پر اندلس میں اموی حکومت

بر سر اقتدار آگئی۔

عبدالرحمٰن داخل نے اس حکومت کی تعمیر و ترقی کے لئے پورے تیس سال کوشش کی۔

۱۷۲ھ میں جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے پیچھے ایک مضبوط حکومت قائم تھی جس کے وارث اس کے بیٹے ہوئے، پہلے ہشام خلیفہ ہوا، پھر عبدالرحمٰن دوم، اور اسی طرح عبدالرحمٰن سوم ملقب بہ ناصر، آخرالذکر کے عہد میں اندلس کی اموی حکومت خوشحالی و ترقی کی انتہا کو پہونچ گئی تھی۔

ناصر کی حکومت تقریباً نصف صدی تک قائم رہی، یہ عرصہ اندلس کا بہترین دور شمار کیا جاتا ہے، قرطبہ اور اندلس کے دوسرے شہر اطبار کا مرکز نگاہ، علوم کا قبلہ اور عالمی ثقافت کا ملجا بنے ہوئے تھے۔

۳۵۰ھ میں عبدالرحمٰن ناصر کی وفات ہوئی تو اس کا بیٹا حکم اور پھر پوتا ہشام خلیفہ ہوا۔ ہشام کمزور شخصیت کا انسان تھا اس لئے درباری لوگ اس پر غالب آگئے جن میں المنصور محمد بن عبداللہ زیادہ نمایاں تھا، یہ خلیفہ کی والدہ "صبح" کی مدد سے امویوں کے نام پر حکومت کرتا رہا، پھر اسے موقع ملا اور اس نے اپنے اور اپنی اولاد کے لئے عامری حکومت کے نام سے حکومت قائم کرلی لیکن یہ زیادہ دنوں باقی نہ رہ سکی۔

تھوڑے عرصہ کے بعد اختیارات پھر اموی لوگوں کے ہاتھوں میں آگئے اور ۴۲۲ھ میں اندلس سے اموی حکومت ختم ہوگئی اور اس کی جگہ چھوٹی چھوٹی کمزور حکومتیں قائم ہوئیں جنھیں "ملوک الطوائف" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، طوائف الملوکی کا یہ دور اندلس میں مسلمانوں کا سب سے برا اور کمزور دور مانا جاتا ہے۔

o o o

o o o

اندلس میں امویوں کے زوال کے دو بڑے سبب تھے۔ ایک یہ کہ انھوں نے اندلس کی ساخت اور مزاج کو یا تو سمجھا ہی نہیں، یا اس کا تقاضا پورا نہ کرسکے، اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ اندلس کے نصرانی ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ انھیں کوئی موقع ملے اور وہ مسلمانوں کو نقصان پہونچائیں، پھر وہاں پر مختلف نسل کے لوگ بستے تھے جن کے مابین قوی ترین رابطہ صرف اسلام تھا، اس مخصوص ساخت سے نمٹنے کے لئے اس کے سوا کوئی اور حل نہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں اسلام کی جڑیں گہری کی جائیں، وقتاً فوقتاً اس کی تجدید کی جائے اور نصرانیوں کے خلاف جہاد جاری رکھا جائے کیونکہ نسل وجنس کے مسائل کو نیست کرنے کے لئے تحریک جہاد سے بہتر کوئی اقدام نہیں، اسی طرح نصرانیوں کو ان کے حدود پر ہمیشہ دفاعی پوزیشن میں رکھا جائے اور کبھی حملہ کا موقع نہ دیا جائے۔

زوال کا دوسرا بڑا سبب یہ تھا کہ بعض اموی خلفاء نے معاملات و مسائل کی باگ ڈور عورتوں اور دربانوں کے حوالہ کر رکھی تھی، جس سے منصور بن ابی عامر جیسے لوگوں کو آسانی سے خلافت پر تسلط کا موقع مل گیا۔

o o o

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جو حکومت اپنی ساخت اور مزاج کو سمجھے بغیر کسی مستقل حل کے لئے کوشاں رہتی ہے اسے زوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اندلس میں تین صدیوں تک حکومت کے بعد بنو امیہ کو اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

طوائف الملوک کا زوال

اندلس میں اموی خلافت کا زوال یکبارگی نہیں ہوا تھا، بلکہ اس کے ساتھ وہی کیفیت پیش آئی تھی جو بعد کے دور میں مصر میں فاطمیوں اور ممالیک کے ساتھ پیش آئی، ان کے ہاتھ سے زعامت پرامن طور پر دوسرے لوگوں کو منتقل ہوگئی اور خون کا ایک قطرہ بھی نہ بہا۔

اندلس میں طوائف الملوکی کے دور سے قبل خلافت سات سالہ لڑکے ہشام کو دی گئی، چونکہ اس کے حکومت سنبھالنے کا سوال نہ تھا اس لئے اسکی ماں صبح کو اس کا نگراں تسلیم کیا گیا، اس نے دوسرے افراد کو اپنے ساتھ شریک بناکر انتظام شروع کیا، ان لوگوں میں ایک شخص منصور بن ابی عامر تھا جس میں بعض عجیب اوصاف تھے۔ منصور نے آسانی سے خلافت کو اپنی جانب منتقل کر لیا اور اس کی اولاد بعد میں اس کی وارث ہوئی، نام کیلئے اموی اشخاص باقی تھے لیکن اختیار کچھ نہ تھا۔

چالیس سال کے بعد یہ حال ہوگیا کہ بنو عامر کی حکومت اندلس میں اموی حکومت کی آخری جھلک بن کر رہ گئی، پھر جب اس کا زوال ہوا تو اس کے ساتھ ہی یہ نظام درہم برہم ہوگیا، اور اس سرزمین پر ایک ایسے دور کا آغاز ہوا جو مسلمانوں کی تاریخ میں سب سے کمزور اور شرمناک دور معلوم ہوتا ہے۔

بیس سے زیادہ حکام بیس سے زیادہ شہروں اور علاقوں میں اموی خلافت کے وارث بنے، ان میں بربر، صقالیہ اور عرب سبھی تھے،

ان کے مابین قومی جنگ وجدال کا طویل سلسلہ جاری رہا، جب کہ نصرانی بادشاہ اپنی اپنی حکومتوں اور عوام کے ساتھ پرسکون وقت گذار رہے تھے، نصرانیوں نے ان بادشاہوں کو ایک دوسرے کے خلاف ورغلانا بھی شروع کردیا اور اس طرح اسلام اور مسلمانوں کی عزت و وقار کو زبردست ٹھیس پہونچی، بعض بادشاہوں نے اپنی کمزوری کے باعث نصرانیوں کو جزیہ دینا قبول کر لیا اور بعض نے اپنے بعض شہران کے حوالے کردیئے، نصرانی فوج کے ساتھ مل کر اپنے مسلم بھائیوں سے نبرد آزما ہوئے۔

ملوک الطوائف کے نام سے اندلس کا جو دور موسوم ہے اس کی برائیوں کو اگر انسان شمار کرنا چاہے تو مشکل ہوگا۔

اس عہد کے بادشاہوں کے مابین جو منافست پیدا ہوگئی تھی اس کے نتیجہ میں شعراء، ادباء اور مغنیوں کی حوصلہ افزائی عام تھی، اس کا سبب نہ تو فن سے محبت تھی نہ شعراء و ادباء کی قدردانی، بلکہ ایک کو دوسرے کے خلاف برانگیختہ کرنا اور جھوٹی شہرت و ناموری حاصل کرنا مقصود تھا۔

ملوک الطوائف میں بنی عباد کے خاندان کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی، اس خاندان میں معتمد بن عباد کو ایک جذباتی شہزادے اور قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

ان بادشاہوں کے مابین اختلاف و منافست کی زیادتی کے ساتھ کمزوری میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور بالآخر یہ نتیجہ ہوا کہ اشبیلیہ اور اندلس کے دوسرے شہروں کی جانب نصرانیوں کی نگاہیں اٹھنے لگیں۔

معتمد بن عباد کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس نے ان خطرات کو محسوس کر کے ان کے مقابلہ کی تدبیر کے لئے کوشش شروع کر دی۔

اس کے سامنے صرف ایک حل تھا اور وہ یہ کہ مغرب عربی کی حکومت سے مدد طلب کرے، چنانچہ اس نے مغرب بعید میں مرابطین سے مدد کی درخواست کی، ملوک الطوائف میں سے بعض نے معتمد سے اپنے اندیشوں کا اظہار کیا تو اس نے اپنا مشہور مقولہ کہا:

"میں صحرا عرب میں اونٹ چرانا صلیبیوں کی سرزمین میں سور چرانے سے بہتر سمجھتا ہوں۔"

پھر مرابطین کا لیڈر یوسف بن تاشفین سمندر اور جبل طارق عبور کر کے اندلس میں مسلمانوں کی مدد کے لئے آگے بڑھا، اور ۴۷۹ھ (۱۰۸۶ء) میں معرکۂ (زلاقہ) میں نصرانیوں کے مقابلہ میں زبردست فتح حاصل کی جس کے نتیجہ میں اندلس میں اسلام کی عمر میں اضافہ ہوگیا۔

پھر یوسف بن تاشفین کو اندازہ ہوا کہ اندلس میں ملوک الطوائف اقتدار کے اہل نہیں، امام غزالی اور دیگر علماء کی جانب سے اسے یہ فتویٰ بھی پہونچا کہ اندلس پر قبضہ کر لینا چاہیئے، چنانچہ اس نے اندلس پر قبضہ کر کے حکام کی ٹولیوں کو وہاں سے ہٹایا جن میں سے بعض ایسے بھی تھے کہ یوسف کے مقابلہ میں نصاریٰ کو بہتر سمجھتے تھے، اس طرح یوسف کو یہ موقع حاصل ہوا کہ اندلس کو پھر سے متحد کر دے۔

مغرب بعید کے شہر (اغمات) میں ملوک الطوائف کے سب سے مشہور بادشاہ ابن عباد نے فقر و ذلت کی حالت میں اپنی زندگی کے بقیہ ایام بسر کئے۔

o o o

ہر دور میں ملوک الطوائف کا یہی انجام ہوتا ہے، جو لوگ موت سے

ڈرتے ہیں انھیں دوسروں سے پہلے مرنا پڑتا ہے، اور جو لوگ اپنے دین کی عزت اور امت کے وجود کی قربانی دے کر محتاجی سے بچتے ہیں انھیں ایسے حالات میں محتاجی سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ وہ سمجھ بھی نہیں پاتے۔

ملوک الطوائف ان حقیقتوں کو فراموش کر چکے تھے، اس لئے انھیں موت بھی آئی تو کرکری بن کر آئی، مریہ کے حاکم ابن صمادح نے اپنے قصر پر حملہ ہوتے ہوئے سنا تو یہی کہا تھا۔ اس لئے ملوک الطوائف کو ہر دور میں زندگی کی تلاش کرنی چاہیئے تاکہ ایسا نہ ہو کہ موت ڈھونڈھیں اور پا نہ سکیں اور اللہ تعالیٰ ان کے لئے موت کو کرکری بنا دے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے۔

فردوس گم شدہ کی داستان

پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) کے ابتدائی سال مسلم اندلس میں اپنے ساتھ ایک خطرناک وبالے کر آئے ۔ اندلس میں اموی حکومت کا آخری سہارا عامری حکومت کا زوال ہوچکا تھا، اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ عبدالرحمٰن داخل کی اولاد اندلس میں اسلام کے تحفظ کا فریضہ انجام نہ دے سکے گی ۔

بربر میں سے بہت سے لوگ قیادت و تسلط کی تلاش میں اندلس آگئے تھے، مختلف نصرانی گروہوں سے تعلق رکھنے والے صقالبہ اندلس کی اسلامی زندگی کا ایک عنصر بن چکے تھے ۔

پانچویں صدی ہجری کی ابتدا میں اندلسی وجود انھیں متنازع قومیتوں سے عبارت تھا، اندرونی اختلافات اور عداوتوں کے نتیجہ میں جب اندلس کی اموی خلافت کو زوال ہوگیا تو اس سرزمین پر بسنے والی مذکورہ نوعیت کی ٹولیاں اٹھ کھڑی ہوئیں ۔

ضرورت تھی کہ یہ لوگ نصرانیوں کے خلاف متحد ہو کر اسلامی جہاد کا جھنڈا بلند کرتے اور اندلس کو نصرانیوں کی جانب سے پیش آنیوالے چیلنج کا مقابلہ کرتے، لیکن اس کے بجائے انھوں نے قومیت کے شعلوں کو ہوا دی اور مختلف نوعیت کے نسلی نعروں کو بلند کیا ۔ اس دور کے اندلس میں بیس سے زائد حکومتیں قائم ہوگئیں جن کے حکمراں اندلس والوں کے ساتھ، بربر، عرب اور صقالبہ تھے، ہر شہر کی مستقل حکومت تھی

بلکہ بعض شہروں میں ایک سے زائد امیدوار تھے ۔

ملوک الطوائف کے نام سے معروف ان بادشاہوں اور ان کی حکومتوں کا یہ حال نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک قائم رہا، اسلام اور مسلمانوں کی توہین ہوئی، مسلمانوں نے اپنے بھائیوں کے خلاف نصرانیوں سے مدد لی، اندلسی مؤرخ ابن حیان نے پس پردہ حالات کو سمجھ کر اپنے بھائیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا : [1]

یا اھل اندلس شدّوا رحالکم
فما المقامُ بھا الاّ من الغلطِ

(اندلس والو! سفر کے لئے تیار ہو جاؤ، یہاں ٹھہرنا یقیناً غلط ہے)

الثوبُ ینسل من اطرافه وأری
ثوبَ الجزیرةِ منسولاً من الوسطِ

(کپڑا کنارے سے پھٹتا یا گھستا ہے لیکن جزیرۂ اندلس کے کپڑے کو میں دیکھ رہا ہوں کہ درمیان سے پھٹ رہا ہے)

مَنْ جاورَ الشرَّ لا یأمن بوائقه
کیف الحیاةُ مع الحیّاتِ فی سَفَط

(شر سے قریب رہنے والا اس کی خرابیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا، سانپ کے ٹھکانوں میں رہ کر کیوں کر زندگی بسر کی جا سکتی ہے ۔)

ملوک طوائف اپنی شیرازہ بندی میں ناکام رہے اور انھیں یہ موقع نہیں مل سکا کہ نصاریٰ کے مقابلہ میں متحد ہو سکیں، قسمت کی یہ عجیب بات

---

[1] بعض لوگوں نے ان اشعار کو ابن عسال کی جانب منسوب کیا ہے ۔

تھی کہ قشتالہ، لیون اور رسٹوریا کا بادشاہ الفانسو ششم ان مسلم بادشاہوں کی حمایت کا اظہار کرتا تھا، اور ان سے جزیہ لیا کرتا تھا جس کی مقدار ہمیشہ بڑھتی رہتی تھی، اسی رقم سے وہ تمام مسلم ملوک طوائف کے خاتمہ کا منصوبہ بنا رہا تھا، اس نصرانی بادشاہ نے سب سے اخیر میں مسلمانوں کے جس شہر پر ان کی نظروں کے سامنے بلکہ ان میں سے بعض کی مدد سے قبضہ کیا وہ طلیطلہ کا شہر تھا، اس پر ۴۷۸ھ (۱۰۸۵ء) میں اس کا قبضہ ہوا۔

اس کارروائی کے بعد معتمد بن عباد کو یقین ہو گیا کہ الفانسو کا ارادہ کیا ہے۔ پھر اس نے اس سے بچاؤ کی تدبیر سوچنی شروع کی، اس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ مغرب بعید میں مرابطین کی نوخیز مسلم حکومت سے مدد کی درخواست کرے۔

چنانچہ اس نے مرابطین سے مدد مانگی، اور وہ نصرانی یلغار کو روکنے میں کامیاب ہوئے۔ الفانسو کا تکبر ختم ہوا، بہت سے مسلم شہروں کو مرابطین نے واگذار کرایا، اس کارروائی سے یہ ثابت ہو گیا کہ اندلس کے لوگ اپنی مدد اور ذاتی ترقی پر قادر نہیں، بلکہ انھیں اس کے لئے اپنے مغربی مسلمان بھائیوں کی مدد کی ضرورت ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اندلس نے مرابطین، موحدین اور بنی مرین سے مدد درآمد کی اور اس طرح تنہا غرناطہ کی اسلامی حکومت دو سو سال سے زیادہ تک موت سے مقابلہ کرتی رہی، اس مدت میں اس کی مثال سورج کی اس لپک جیسی تھی جو غروب سے پہلے پیدا ہو جاتی ہے۔

o o o

لیکن تہذیب کا قانون اپنا فیصلہ دے چکا تھا، جو لوگ خود سے اپنے

اندر زندگی کی قوت نہ پیدا کر سکے انھیں باہر سے فتح و نصرت درآمد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکا۔

۸۹۷ھ (۱۴۹۲ء) میں اندلس کی آخری اسلامی حکومت کا زوال ہوا اور وہاں سے مسلمانوں کو بری طرح نکالا گیا۔

اس انجام کی طرف شاعر ابن حیان پہلے اشارہ کر چکا تھا، اور ان لوگوں نے اس کی تائید کی تھی جو دنیا میں بقا سے متعلق قانون قدرت سے واقف تھے، اور جنھیں یہ علم تھا کہ فتح و نصرت کی درآمد سے تاریخ نہیں بنتی اور نہ کوئی تحریک اس کی بھیک مانگ کر آگے بڑھ سکتی ہے۔

اندلس کا ایک دوسرا واقعہ

حالات انتہائی بُرے تھے ۔ اور جب بھی کسی آبادی کے فسق و فجور اور خدا کی نافرمانی کے باعث تاریخ کی حرکت کسی مسدود راستہ تک پہونچ جاتی ہے تو ایسی صورت میں صرف ایک چیز کی امید کی جاسکتی ہے اور وہ ہے زوال . . . تاریخ کی تفسیر میں صرف یہی صحیح نتیجہ ہے ۔ قوانین الٰہیہ کی جب نافرمانی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نافرمانوں کو مہلت ملتی ہے تو اس سے ان کے اندر اور زیادہ جرأت پیدا ہوجاتی ہے ، پھر زوال کے جملہ اسباب اکٹھا ہوجاتے ہیں ، اصلاح کا دروازہ بند ہوجاتا ہے ، اس کے بعد مختلف مصائب کی صورت میں ہلاکت کا سامان فراہم ہوجاتا ہے ۔

ساتویں صدی ہجری میں اندلس کا حال کچھ اسی طرح کا تھا ، اسی صدی میں وہاں کے اکثر شہروں اور قلعوں کا سقوط واقع ہوا ، غرناطہ کی حکومت سب سے آخر تک باقی رہی ، یعنی اسے ۲ دو صدی بعد زوال ہوا ۔

پورے اندلس میں صلیبیوں کی طرف سے بازیافت کی تحریک شروع ہوئی اور اس نے باہم دست و گریباں مسلمانوں کو جن میں سے اکثر کسی نہ کسی نصرانی بادشاہ کی حمایت کا دم بھرتے تھے ، ان کی موت کی جانب دھکیلنا شروع کر دیا ۔

اندلس میں جب موحدین کا زوال ہوا تو وہاں کے مسلمانوں کا شیرازہ پوری طرح بکھر گیا ، پھر نہ تو انھیں اسلامی خلافت جمع کر سکی ، نہ خارجی چیلنج جمع کرسکا ، نہ کوئی ایسا عقیدہ انھیں متحد کرسکا جس کی گرمی ان کے دلوں

میں ہو اور جو انھیں اپنی ذات سے زیادہ عزیز ہو ، لہٰذا موحدین کے زوال کے بعد اندلس کے شہروں میں سے مرسیہ ، بلنسیہ ، قرطبہ ، مشرقی اندلس اور پھر مغربی اندلس جس کا دارالحکومت اشبیلیہ تھا ، سب کے سب زوال کی زد میں آگئے ۔

موحدین کے زوال کے بعد اشبیلیہ والوں کو اندازہ ہوگیا تھا کہ انھیں اب کسی خارجی مدد کی ضرورت ہے ، چنانچہ انھوں نے ٹیونس میں حفصیوں کے امیر ابو زکریا کے ہاتھ پر بیعت کی رضامندی کا اظہار کیا ، حفصی حاکم نے اپنے جن لوگوں کو اشبیلیہ بھیجا انھوں نے اشبیلیہ والوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جس کے نتیجہ میں اشبیلیہ کے لوگوں نے انھیں نکال دیا اور قشتالہ کے نصرانی بادشاہ فرناند سوم کے ساتھ اپنے معاہدہ کو توڑ کر اس معاہدہ کی تجویز پیش کرنے والے شخص (ابن الجد) کو قتل کر دیا ۔

یہیں سے اشبیلیہ کے خاتمہ کی ابتدا ہوئی ، اب انھیں کسی خارجی امداد کی امید نہ تھی ، اور قشتالہ کے ساتھ اپنے معاہدہ کو ختم کرکے انھوں نے ایسی جنگ کا آغاز کر دیا تھا جس کے لئے ان کے حالات سازگار نہ تھے ۔

۶۴۴ھ میں اشبیلیہ کے خلاف نصرانیوں کی تگ و دو شروع ہوئی اور اسی سال وہ اشبیلیہ کے اطراف پر قابض ہوگئے ، غرناطہ کے مسلم بادشاہ ابن الاحمر نے فرناند کے ساتھ اپنے معاہدہ کی وجہ سے اشبیلیہ پر قبضہ کے سلسلہ میں نصرانیوں کی مدد کی !

دوسرے سال پھر نصرانی فوج اشبیلیہ کی جانب بڑھی ، اور ابن احمر کی مداخلت سے متعدد اسلامی شہروں پر قابض ہوگئی ، ابن احمر نے مسلمانوں کو یہ کہہ کر مقابلہ سے روک دیا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ۔

پھر نصرانیوں نے ہر طرف سے اشبیلیہ کا محاصرہ کرلیا، اس محاصرہ میں نصرانیوں کو ابن الاحمر کا تعاون بھی حاصل تھا، دونوں فریق مل کر اسلام کی دعوت اور مسلمانوں کے وجود کو مٹانے پر مصر تھے، اور محاصرہ میں گھرے ہوئے مسلمان اس المناک و شرمناک صورت حال کو آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

اشبیلیہ کے معزز مسلمان تقریباً ایک سال تک نصرانیوں کے محاصرہ کا مقابلہ کرتے رہے، ابن الاحمر کی مدد کے باوجود نصرانیوں کو مختلف موقعوں پر مسلمانوں کے ہاتھوں نقصان اٹھانا پڑا۔

محاصرہ کی حالت میں مسلمانوں نے اہل مراکش سے مدد کی درخواست کی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، بلکہ رسد وغیرہ کا پہونچنا بھی بند ہوگیا، دوسری طرف نصرانی فوج کو برابر امداد ملتی رہی۔

پھر نوشتۂ تقدیر صادق آیا، معاہدہ کے مطابق مسلمان اشبیلیہ چھوڑ کر اندلس کے دوسرے شہروں کو چلے گئے لیکن ان شہروں کا انجام بھی ہزیمت ہی تھا۔

سیکڑوں شہروں میں ابن الاحمر کی ترغیب یا موت کے ڈر سے جن مسلمانوں نے ہتھیار رکھ دئے تھے اگر وہ متحد ہو کر برابر لڑتے رہتے تو یقیناً ان کا انجام اندلس میں اس سے زیادہ برا نہ ہوتا جیسا ہوا۔

لیکن تاریخ کا سفر مشیت الٰہی سے ہوتا ہے، جب اللہ تعالیٰ کے قوانین کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو زوال کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں، اصلاح کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے اور اجتماعی مشکلات کی صورت میں موت سامنے آجاتی ہے، یہی اللہ کی سنت ہے اور اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔

رکنِ فردوس کا زوال

تاریخ کا مطالعہ اگر سخت دل ضدی طالب علم کی طرح نہیں بلکہ معلومات و تجربہ کے لئے کیا جائے تو اس میں ہمیں اپنی تصویر کے ساتھ ساتھ اپنے معاشرے کی تصویر اور اپنے زمانے کے واقعات کا مرقع نظر آئے گا ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہوگا کہ جو لوگ اپنے آپ کو تاریخ کی سب سے بہتر کڑی سمجھتے ہیں وہ دھوکہ میں ہیں اور ان کی سادہ لوحی حماقت کی حد کو پہونچی ہوئی ہے۔

اندلس سے ہمارے نکلنے کی داستان کا ماحصل یہ نہیں کہ دشمن اپنی قوت و تدبیر سے ہم پر غالب آگیا، بلکہ اس میں ہماری اپنی ذات سے ہزیمت کی داستان مضمر ہے، ہم اپنے ہاتھوں ضائع ہوئے، ہم میں ایک نے دوسرے کو اس طرح کھالیا جس طرح بعض جانور دوسرے کو کھا لیتے ہیں۔

۶۳۳ھ میں اندلس کے سب سے بڑے اسلامی ٹھکانے قرطبہ کا زوال اس سرزمین پر ہمارے زوال کی ابتدا تھی۔

حکومت غرناطہ کے بانی ابن الاحمر نے قشتالہ کے نصرانی بادشاہ کے ساتھ صلح کرلی تھی، اور اپنے شہروں میں سے جیان، اس کے نواحی، ارجونہ، بیع الحجار، قلعۂ جابر اور فرنتیرۃ کی سرزمین اس کے حوالہ کردی تھی، ابن الاحمر نے قشتالہ کے بادشاہ کی اطاعت تسلیم کرتے ہوئے یہ اقرار بھی کیا تھا کہ سالانہ ڈیڑھ لاکھ مرافیدی (اسپینی سکہ)

بطور جزیہ ادا کرے گا اور مسلمانوں کے خلاف لڑائیوں میں اس کا ساتھ دے گا ، اس صلح کے بعد شاہ قشتالہ کو اطمینان کے ساتھ مسلمانوں سے انتقام کا موقع مل گیا ، چنانچہ اس نے مغربی اندلس کے اہم شہر اشبیلیہ پر حملہ کر دیا ، اس حملہ میں ابن الاحمر کی بھیجی ہوئی ایک مسلم ٹولی بھی نصرانیوں کی مدد کر رہی تھی ۔ اسلامی ثقافت و تہذیب کا مرکز اشبیلیہ ۶۴۶ھ میں ابن الاحمر کی مدد سے شاہ قشتالہ فرنانڈ سوم کے قبضہ میں چلا گیا اور پھر آج تک وہاں پر اسلام واپس نہ آسکا ۔

بیس سال بعد ابن الاحمر اور شاہ قشتالہ کے مابین صلح کے خاتمہ کا وقت آیا تو ابن الاحمر نے معاہدہ کی تجدید کے لئے کوشش کی اور اس کے لئے سو سے زائد شہروں اور قلعوں کو شاہ قشتالہ کے حوالہ کر دیا ۔

یہاں جرم صرف ابن الاحمر کا نہ تھا ، بلکہ تمام ملوک طوائف اس جرم میں شریک ہیں ، ان کا ذہن ایسا بن گیا تھا کہ سب کچھ کر سکتے تھے ، صرف اسلام کے لئے اخلاص و اتحاد مشکل تھا ۔

o o o

اندلس کے مسلمانوں نے یہ تو پسند کر لیا کہ دشمنوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں ، اپنی زمین اور علاقے ان کے حوالہ کر دیں ، ذلت و خواری کی صلح کے بعد جزیہ ادا کرنا قبول کر لیں ، اپنے بھائیوں کے مقابلہ میں دشمنوں سے مدد لے لیں ... یہ سب ممکن اور آسان تھا ، لیکن اقتدار کی محبت اور دنیا کی بندگی سے اوپر اٹھ کر اسلام کی جانب واپسی اور اتفاق و اتحاد کے ساتھ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے میں ان کے لئے عار تھی ، اندیشے تھے اور رکاوٹیں تھیں ۔

فطری طور پر ان حالات میں بہت سی ترقی پسند قومی وجدتی تحریکیں رونما ہوئیں ، نصرانیوں نے اس طرح کے رجحانات کی حوصلہ افزائی کی ، اور انھیں اسباب کی بنا پر اس دور میں مسلمانوں کی مشکلات کا صحیح اسلامی حل ان کے سامنے نہ آسکا اور وہ اس کو اختیار نہ کر سکے ۔

مشرقی اندلس میں یہ حالات مزید تشویشناک شکل میں سامنے آرہے تھے ، بلنسیہ میں موحدین کا آخری حاکم ابو زید بن ابو عبد اللہ اپنی حکومت کے زوال کے بعد پناہ گزیں تھا ، شاہ ارجوان کے ساتھ ہو کر اس نے مسلمانوں کے خلاف لڑائیوں میں حصہ لیا اور صرف اسی شرمناک رویہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے "انقلابی فیصلہ" کے نتیجہ میں نصرانیت قبول کرنے کا اعلان کر دیا ۔

۶۳۱-۶۳۶ھ کی مدت میں جب کہ بلنسیہ کے شہر ، قلعے اور گاؤں یکے بعد دیگرے دشمنوں کے ہاتھوں میں جا رہے تھے ، ابو زید اسلام کے خلاف جنگ میں نصرانیوں کی پوری طرح مدد کر رہا تھا ، اور انھیں اپنے سابقہ دینی بھائیوں کی کمزوریوں سے آگاہ کر رہا تھا ۔ دوسری طرف ابن الاحمر اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف شاہ قشتالہ کی مدد کر رہا تھا ۔

اس موقع پر اگر یہ سوال پیدا ہو کہ :

ہم اندلس سے کیوں نکالے گئے ؟ تو یقیناً اس کا صرف ایک جواب ہو گا اور وہ یہ کہ : اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا ، بلکہ لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں ۔

تاریخ میں ہمارے لئے عبرت کی چیز خود ہمارے زوال کی داستان ہے ، جب ہمارا کوئی عضو صرف اپنی فکر میں لگا رہے گا تو یقیناً تمام اعضاء زوال

کا شکار ہو جائیں گے۔

زوالِ غرناطہ

اندلس میں غرناطہ کی مسلم حکومت کا مزید دو صدیوں تک باقی رہ جانا اسلام کا ایک معجزہ تھا۔

عداوت و کینہ سے پُر صلیبیت کے سمندر میں تیرتے ہوئے اس جزیرہ کے ڈٹے رہ جانے کا راز اسلامی عقیدہ و تعلیمات میں مضمر ہے۔ اندلس کے تمام شہروں اور قلعوں کے زوال کے بعد دو صدی تک غرناطہ کی حکومت محض اسلامی عقیدہ کی قوت کے باعث باقی رہی۔

اس حکومت نے دشمنوں کے چیلنج کو قبول کیا، اور علمی و تمدنی ترقی کی راہ میں کوششوں کا سلسلہ جاری رکھا، اہل غرناطہ کو احساس تھا کہ دشمن ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہیں اور ان کو ختم کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں ہیں، باہر کی مسلم دنیا سے امداد کی کوئی توقع نہیں، صرف اپنے اوپر بھروسہ کرنا ہے۔ یہی احساس ان کی تیاری اور اسلامی جہاد کا جھنڈا بلند رکھنے کا باعث تھا۔

اس طرح غرناطہ ۱۴۹۲ء (۸۹۷ھ) تک مسلم اندلس کا سربراہ اور یورپ میں علم و تہذیب کا مینار بنا رہا۔

لیکن زوال سے قریب کے سالوں میں اندلس کی زندگی میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوئیں، نصرانیوں کی دو حکومتوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک متحدہ محاذ بنا لیا، قشتالہ کی ملکہ ایزابیلا نے ارجوان کے بادشاہ فرناند سے شادی کر لی، دونوں کے دلوں میں یہ آرزو کروٹیں لے رہی تھی کہ غرناطہ کے قلعۂ حمراء میں ہنی مون

منائیں اور اس کے برج پر صلیبی جھنڈا لہرائیں۔

دوسری طرف غرناطہ کے حاکم خاندان کے افراد میں آپس میں اختلافات رونما ہو چکے تھے جس کے نتیجہ میں اسلامی مملکت دو حصّوں میں بٹ گئی تھی، اور ہر ایک حصہ دوسرے کا مخالف و دشمن تھا۔ ایک حصہ دار الحکومت غرناطہ کا تھا جس پر ابو عبداللہ محمد علی ابو الحسن نصری کا تسلط تھا جو شاہان غرناطہ کا آخری بادشاہ تھا۔ اور دوسرا حصہ (وادی آش) اور اس کے ماتحت علاقوں کا تھا، اور اس حصہ پر شاہ غرناطہ کے چچا ابو عبداللہ محمد عرف (الزغل) کا تسلط تھا۔

۸۹۴ھ میں مذکورہ دونوں نصرانی بادشاہوں نے وادی آش پر حملہ کر کے مریہ اور بسطہ وغیرہ پر قبضہ کر لیا اور اس طرح انھیں غرناطہ سے قریب پہونچنے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے ابو عبداللہ نصری کے پاس قاصد بھیج کر یہ مطالبہ کیا کہ وہ اگر جاں بخشی چاہتا ہے تو شہر الحمراء کو ان کے حوالہ کر دے۔ تاریخ میں بادشاہوں کے دستور کے مطابق اس بادشاہ نے بھی اس صورتِ حال کا اندازہ نہیں لگایا تھا، لیکن جب یہ مطالبہ سامنے آیا تو اسے یہ ضرور اندازہ ہو گیا کہ غرناطہ کو دشمنوں کے حوالہ کرنے کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے، یہ شہر اگر دشمنوں کے ہاتھ میں گیا تو گویا اندلس میں اسلام کا آخری شہر نکل جائے گا۔ یہ سوچ کر اس نے انکار کر دیا، جس کے نتیجہ میں مسلمانوں اور نصرانیوں کے مابین جنگ شروع ہو گئی اور تقریبًا دو سال تک جاری رہی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی قیادت موسیٰ بن ابی غسان کے ہاتھوں میں تھی جو فوجیوں کے دلوں میں جوش و جذبہ بیدار کر رہا تھا، اس اسلامی قائد کی حیثیت سورج کی ان کرنوں جیسی تھی جو ڈوبتے وقت تیز ہو جاتی ہیں۔

اس قائد کی ہمت و بہادری اور اس جیسے دوسرے فوجیوں کی بے جگری

سے غرناطہ دو سال تک نصرانی حکام کے مقابلہ میں ڈٹا رہا اور سات ماہ تک وہاں کے باشندوں نے محاصرہ کی صعوبتیں برداشت کیں۔

پھر بھی اس تصادم کا انجام سامنے تھا، ابو عبداللہ اندرونی اختلافات اور خانگی جھگڑوں کے باعث غرناطہ کا تحفظ نہ کرسکا، جب کہ نصرانی محاذ ہر طرح مضبوط و متحد تھا، پچھلی تاریخ میں مسلمانوں کی طرف سے اسلام کے خلاف قومی رجحانات اور اقتدار کے لئے باہمی کش مکش کی مثالیں بھی موجود تھیں، اور انھیں عوامل و محرکات کے باعث اندلس میں اسلام کا آخری چراغ بھی گل ہوگیا۔

غرناطہ کا آخری مسلم بادشاہ ابو عبداللہ اندلس کی سرزمین کو، جو آٹھ صدیوں تک یورپ کے اسلامی حکمرانوں کے زیر سایہ رہ چکی تھی، الوداع کہتے ہوئے غرناطہ سے روانہ ہوا تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے [1] اور اپنی ماں کا یہ جملہ یاد آیا کہ: جس ملک کو مردوں کی طرح محفوظ نہ رکھ سکو اس پر عورتوں کی طرح آنسو بہاؤ۔

ابو عبداللہ کا یہ جملہ بلاشبہ اس کے لئے اور اس جیسے دوسرے بہت سے حاکموں کے لئے ایک طمانچہ تھا جو اپنی حکومتوں کو مردانہ شان سے بچا نہ سکے تو عورتوں کی طرح آنسو بہانا شروع کیا۔

---

[1] اسی طرح مصری ڈکٹیٹر جمال عبدالناصر نے عرب دنیا کو ان مشکلات میں ڈال کر جن کے ازالہ کے لئے کم از کم دو سو سال درکار ہوں گے، آنسو بہائے تھے، اور یہی حال تمام اسلام دشمن افراد کا ہوتا ہے کہ ان سے امت کو ذلت و خواری کے سوا کچھ اور نہیں ملتا۔

فصل دوم

مشرقی حکومتوں کا زوال

- بنو امیہ کی فاتح حکومت کا زوال
- مصر کے بنو طولون کا زوال
- صفاریوں کے زوال کی داستان
- اخشیدیوں کا زوال
- ایران میں سامانیوں کا زوال
- خلافت پر قابض ہونے والے بویہی حکام کا زوال
- طبرستان کے علیحدگی پسندوں کا زوال
- بنو حمدان کے زوال کی داستان
- خلافت کے حامی سلجوقیوں کا زوال
- فاطمیوں کا زوال
- صلاح الدین کی حکومت کا زوال
- عباسیوں کے زوال کے اسباب
- معرکۂ عین جالوت کے ہیرو مملیک کا زوال

نام کتاب : عظمت رفتہ

نام مصنف : ڈاکٹر عبدالحلیم عویس

نام مترجم : ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری

اشاعتِ اول : مارچ ۱۹۸۷

کاتب : عبدالخالق خلیق بستوی

مطبع : اسرار کریمی پریس الہ آباد ۳.

ملنے کے پتے

۱- مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، وارانسی ۲۲۱۰۱۰

۲- جمعیۃ اہل حدیث ہند، اہلحدیث منزل، ۴۱۱۶، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶

۳- دار المعارف، ۱۳۱، محمد علی بلڈنگ، بھنڈی بازار، ممبئی ۴۰۰۰۰۳

۴- ابناء الجامعۃ السلفیۃ، ص ب (۱۰۰۳۳) المدینۃ المنورۃ۔
(سعودی عرب)